کمالات لوگ کم گزرے ہیں، جن کو اتنے گوناگوں اور متنوع علوم میں اس قدر رسوخ اور ایسی مکمل مہارت حاصل رہی ہو۔ ان میں کمالات اور جامعیت کی وجہ سے مورخین نے انہیں امام عصر، فاضل، متقن، العالم البحر اور العلامۃ المتبحر لکھا ہے۔" ۱۶ ۔

"صحیح ابن حبان" آپ کی مشہور و معروف کتاب ہے۔ اس کا نام التقاسیم والانواع بھی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م۱۱۷۶ھ) نے اس کو طبقات حدیث کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے۔ ۱۷ ۔

علامہ عبدالحی بن العماد الحنبلی (م۱۰۸۹ھ) لکھتے ہیں۔

"(۱) ...... صحیح ابن حبان کی سب سے زیادہ اہم خصوصیت اس کی صحت ہے۔ صحیح میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ابن خزیمہ کی کتاب کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ بعض محدثین نے اس کو سنن ابن ماجہ سے زیادہ روایتوں کا مجموعہ بتایا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ صحیحین کے بعد بہتر اور عمدہ مجموعے ابن خزیمہ اور ابن حبان کے ہیں۔

(۲) ...... صحیح ابن حبان کو مروجہ طریقوں پر مرتب نہیں کیا گیا بلکہ اقسام و انواع پر مرتب کیا گیا ہے۔

(۳) ...... ہر حدیث کے آخر میں رجال و اسناد کی تحقیق، حدیث کے مفہوم کی تعیین و وضاحت اور اسنادی متون کی فنی بحثیں اور دوسرے مفید امور بیان کئے گئے ہیں۔" ۱۸ ۔

حال ہی میں مولانا عبدالشکور اثری، ناظم المکتبۃ الاثریہ، اردو بازار لاہور نے اس کو ۷ جلدوں میں بہترین کاغذ اور طباعت میں شائع کیا ہے۔

امام طبرانی (م۳۶۰ھ)

امام طبرانی کا نام سلیمان بن احمد اور کنیت ابوالقاسم تھی۔ ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹ ۔ اور ۳۶۰ھ میں سو سال کی عمر میں آپ نے وفات پائی۔ ۲۰ ۔ امام طبرانی کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ امام ابو عبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی (م۳۰۳ھ) بھی آپ کے اساتذہ میں سے ہیں۔

۱۵ سال کی عمر میں تحصیل علم کے لئے نکلے اور حمص ' جبلہ ' مدائن ' شام ' مکہ معظمہ ' مدینہ منورہ ' یمن ' مصر ' بغداد ' کوفہ ' بصرہ ' جزیرہ ' فارس ' اصفہان گئے۔ اور ہر جگہ اہل فن سے استفادہ کیا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) لکھتے ہیں :

"۳۰ سال تک ان کو بستر پر سونا نصیب نہیں ہوا۔ مگر وہ آرام و آسائش کا خیال کئے بغیر حدیث کی تحصیل میں مشغول اور بوریا پر سوتے رہے" ۲۱۔

امام طبرانی کے حفظ و ضبط ' عدالت و ثقاہت ' علم و فضل و اور تبحّرِ علمی کا اربابِ سیر اور علمائے فن نے اعتراف کیا ہے۔ ذہبی (م ۷۴۸ھ) لکھتے ہیں کہ "طبرانی بڑے عظیم رتبہ کے محدث تھے۔ ۲۲۔ ' دین کے معاملہ میں بہت سخت تھے۔ ان کو صحابہ کرامؓ سے غیر معمولی محبت و عقیدت تھی" ۲۳۔

امام صاحب کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مگر ان میں معجم کبیر ' معجم اوسط اور معجم صغیر بہت زیادہ مشہور ہیں۔ محدثین کی اصطلاح میں معجم ان کتابوں کو کہتے ہیں ' جن میں شیوخ کی ترتیب سے احادیث درج کی جاتی ہیں اور بعض کتابوں میں شیوخ کی وفات اور ان کے علم و تقویٰ کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے لیکن عموماً حروف تہجی کے لحاظ سے معاجم ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ اور بلاد و امصار کی ترتیب پر بھی معاجم مرتب کئے گئے ہیں۔

امام طبرانی نے تین معاجم ترتیب دیئے ' جس کی وجہ سے ان کی بہت شہرت ہوئی۔ معجم کبیر میں آپ نے مشہور صحابی حضرت ابو ہریرہؓ (م ۵۹ھ) جن کا شمار کثیر الروایات صحابہ میں ہوتا ہے۔ ۲۴ ان کی روایات جمع نہیں کیں۔ امام صاحب ان کی روایات علیحدہ مرتب کرنا چاہتے تھے لیکن مرتب نہ کر سکے۔ معجم اوسط کو شیوخ کے ناموں پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں امام صاحب نے اپنے ایک ہزار شیوخ کے افراد و غرائب جمع کئے ہیں۔ معجم صغیر کی ترتیب بھی شیوخ کے ناموں پر ہے اور ایک ہزار سے زیادہ شیوخ کی ایک ایک حدیث اس میں درج کی ہے اور کتاب کے آخر میں بعض خواتین کی حدیثیں درج کی ہیں جن کی تعداد ۲ ہزار کے قریب ہے۔ معجم صغیر ۱۳۱۱ھ میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی۔ ۲۵۔

(باقی صـ۶۳ پر)

لغات واعرابِ قرآن

(۱۱)

پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرہ (۶)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے۔ اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورت کا قطعہ نمبر (جو زیرِ مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحثِ اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیرِ مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے۔ بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیرِ بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲ : ۵ : ۱ (۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲ : ۵ : ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم ــــ وھکذا۔

۶:۲ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

۲ : ۶ : ۱ اللغۃ

۲ : ۶ : ۱ (۱) [خَتَمَ] کا مادہ "خ ت م" اور وزن "فَعَلَ" ہے۔ یعنی یہ ثلاثی مجرد کے فعل ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب (پہلا صیغہ) ہے۔ اس مادہ (ختم) سے فعل ثلاثی مجرد باب ضرب سے اور ہمیشہ متعدّی آتا ہے۔ اکثر صلہ "علیٰ" کے ساتھ

اور کبھی بغیر صلہ کے (مفعول بنفسہ کے ساتھ) آتا ہے۔ مگر دونوں صورتوں میں ـــــ ایک ہی باب (ضرب) سے ہوتے ہوئے بھی ـــــ معنی الگ الگ ہوتے ہیں اور عربی میں یہ فرق مصدر کے فرق سے ظاہر ہوتا ہے اس کی تفصیل یوں ہے:-

" علیٰ " کے صلہ کے ساتھ یہ فعل ختم علی ..... یختِم خِتامًا کی شکل میں آتا ہے اور اس کے معنی " ...... پر مہر لگا دینا ' ...... کو سربمہر کر دینا" [تاکہ اب "اس" میں نہ کچھ داخل ہو سکے اور نہ کچھ اس سے نکل سکے]۔ قرآن کریم میں اس فعل سے ـــــ اور ان معنی کے لیے ـــــ صیغۂ ماضی (خَتَمَ) تین جگہ [البقرہ : ۷ ، الانعام : ۴۶ اور الجاثیہ : ۲۳] اور صیغۂ مضارع (یختِم) ایک جگہ (الشوریٰ : ۲۴) اور "نَختِمُ" (جمع متکلم) بھی ایک جگہ (یٰسٓ : ۶۵) آیا ہے۔ اور ہر جگہ ان صیغوں کے ساتھ صلہ " علیٰ " ہی آیا ہے ـــ ان (مذکورہ بالا) معنی کے لیے اس فعل کا مصدر عموماً "خِتام" ہوتا ہے جو قرآن کریم میں بھی ایک جگہ (المطففین : ۲۶) وارد ہوا ہے۔ اردو محاورے اور علی کے صلہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے مترجمین نے یہاں " ختم "...... " کا ترجمہ " مہر کی "، " مہر کر دی " ، "بند لگا دیا " ، " مہر لگا دی " ، " مہر لگا رکھی ہے " سے کیا ہے۔

صلہ کے بغیر یہ فعل ثلاثی مجرد (اسی باب ضرب سے) خَتَمَ .... یختِم ختمًا آتا ہے اور اس کے معنی " .... (کسی کام) ..... کو پورا کر لینا " ہوتے ہیں مثلاً خَتَم الکتابَ : اس نے پوری کتاب پڑھ لی یا خَتَم العملَ : اس نے کام مکمل کر لیا۔ اس صورت میں اس فعل کا مصدر عموماً " خَتْم " آتا ہے [اور اسی سے " خَتْمُ القرآن " استعمال ہوتا ہے] تاہم ان معنوں میں ـــ یا صلہ کے بغیر ـــ یہ فعل قرآن کریم میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔ عربی زبان میں تو اس مادہ (ختم) سے مزید فیہ کے بعض ابواب سے بھی افعال مختلف معنوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں ـــ بلکہ لفظ " اختتام " ـــ جو باب افتعال کا مصدر ہے۔ اردو میں بھی مستعمل ہے ـــ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے مزید فیہ کا بھی کوئی فعل نہیں آیا ہے۔

[الله] کے امکانی مادہ اور اشتقاق وغیرہ پر " بسم الله " کی بحث

میں بات ہو چکی ہے ۔ دیکھئے ۱:۱:۱ (۲)

۲:۶:۱ (۲) [عَلٰی قُلُوْبِهِمْ] جو علی (پر) + قلوب (دلوں) + هُم (ان کے) کا مرکب ہے ۔ ان (تین) کلمات میں سے : [علی] تو یہاں گذشتہ فعل "ختم" کے صلہ کے طور پر آیا ہے اور "خَتَمَ عَلٰی" کے معنی اور مصدر پر بات ابھی اوپر گزری ہے ـــــ تاہم بطور حرف الجرّ کے بھی اس (عَلٰی) کے متعدد معنی اور استعمالات ہیں ۔ اہم اور زیادہ مستعمل مواقع کا اردو ترجمہ حسبِ موقع (۱) ..... پر (۲) ..... کے اوپر (۳) ..... کے باوجود (۴) ..... کے ہوتے ہوئے (۵) ..... کے موقع پر (۶) ..... کے خلاف (۷) ..... کی بنا پر ۔ وغیرہ سے کیا جا سکتا ہے ۔ اور یہ (علی) کبھی کسی دوسرے حرف الجرّ مثلاً مِنْ (سے) ، بِ (کے ساتھ) اور فی (میں) کے معنی میں بھی آتا ہے ـــــ اور یہی (علیٰ) مختلف افعال کے ساتھ بطور صلہ استعمال ہو کر ان میں متعدد معانی پیدا کرتا ہے ۔ یہ بات پہلے بھی (۱:۶:۱ (۳)) بیان ہو چکی ہے کہ ضمائر کے ساتھ استعمال ہوتے وقت اس کا ملفوظی الف مقصورہ "یاء" میں بدل جاتا ہے یعنی اسے عَلٰی ("علا") کی بجائے "عَلَیْ" پڑھا جاتا ہے اور [قلوب] کا مادہ "ق ل ب" اور وزن "فُعُوْلٌ" ہے ۔ یہ لفظ جمع مکسر ہے اس کا واحد "قَلْبٌ" ہے جس کا اردو ترجمہ "دل" ہے ۔

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد قَلَبَ .... یَقْلِبُ قَلْبًا (عموماً باب ضرب سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی "..... کو اُلٹ دینا / پلٹ دینا" ہوتے ہیں ۔ یہ فعل حسی نیز معنوی "اُلٹ پلٹ" کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً "قَلَبَ الرداءَ" (چادر کو الٹ دینا ۔ اوپر کا حصہ نیچے یا اندر کا حصہ باہر کر دینا) ، "قَلَبَ الامرَ" (معاملے کی خوب جانچ پڑتال کرنا) ۔ قرآن کریم میں اس کا فعل ثلاثی مجرد تو بصیغۂ مضارع مجہول صرف ایک جگہ (العنکبوت : ۲۱) آیا ہے (اور اس میں بھی بابِ افعال سے ہونے کا احتمال موجود ہے) ۔ البتہ مزید فیہ کے ابواب تفعیل ، تفعّل اور انفعال سے افعال کے کچھ صیغے اور بعض مصادر اور اسماء مشتقہ تیس ۳۰ سے زائد مقامات پر وارد ہوئے ہیں ۔ ان سب پر اپنی اپنی جگہ بات ہوگی ۔ انشاء اللہ ۔

کلمۂ " قلب " (جس کی جمع " قلوب " اس وقت زیرِ مطالعہ ہے) اسی مادہ سے ثلاثی مجرد کا مصدر بھی ہے اور ایک اسم بھی۔ اس کا عام اردو ترجمہ " دل " ہی کیا جاتا ہے۔ یعنی انسانی جسم کا صنوبری شکل کا وہ اندرونی عضو جو بدن میں دورانِ خون کا ذمہ دار ہے۔ یہ لفظ (قلب) بصیغۂ واحد (مفرد یا مرکب) کل ۱۴ جگہ اور اس کی جمع (قلوب) مفرد یا مرکب صورت میں کل ۱۱۲ جگہ (قرآن کریم میں) آئی ہے۔ تاہم قرآن کریم میں " قلب " کے اعمال و افعال اور صفات و کیفیات جس طرح بیان ہوئی ہیں، ان کا تعلق علم افعال الاعضا (PHYSIOLOGY) سے نہیں بلکہ نفسیات اور روحانیات سے ہے۔ اس لیے مجازاً " قلب " کو حسبِ موقع باطن، ذہنی کیفیت، عقل، ضمیر، روح، نفس، قوتِ ادراک وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور قلب کو انسان کی باطنی، روحانی، ذہنی اور نفسیاتی کیفیات و جذبات اور ارادہ و احساسات کا مرکز قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک کیفیت " دل پر مہر لگ جانا ہے " جو یہاں مذکور ہوئی ہے۔ قرآن کریم کی سوا سو سے زائد[۱۲۵] " آیات القلب " اہلِ تفسیر کا عموماً اور اہلِ تصوّف کا خصوصاً موضوعِ بحث ہیں۔ بلکہ شاید بعض جدید علوم مثلاً نفسیات اور تحلیلِ نفسی کے ماہرین کے لیے بھی قابلِ توجہ ہو سکتی ہیں۔ تاہم اس قسم کی بحث میں جانا ہمارے موضوع اور دائرہ کار سے خارج ہے۔

" علی قلوبھم " کا ترجمہ بیشتر مترجمین نے لفظ " قلوب " کی جمع کی رعایت سے " ان کے دلوں پر " کیا ہے۔ تاہم بعض نے صرف واحد کے ساتھ " ان کے دل پر " سے بھی ترجمہ کیا ہے جو شاید اردو محاورے کے اعتبار سے درست ہو مگر الفاظِ عبارت کے لحاظ سے محلِ نظر ہے۔

۲:۶:۱ (۳) [وَعَلٰى سَمْعِهِمْ] جو وَ + عَلٰى + سَمْع + هم ہے اس میں " وَ " تو عاطفہ بمعنی " اور " ہے۔ " علی " گزشتہ فعل " ختم " کا صلہ ہے اور اس (علی) کی تکرار تاکید اور زور کے لیے ہے جسے اردو میں " بھی " (یعنی " پر بھی ") سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ آخری " ھم " ضمیر مجرور بمعنی " ان کا "

ہے اور [سَمْعٌ] کا مادہ " س م ع " اور وزن " فَعْلٌ " ہے ۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد " سمِع ..... یسمَع سَمْعًا " (باب سمِع سے بلکہ اسی فعل سے باب کا نام اخذ کیا گیا ہے) آتا ہے ۔ اس کے معنی " .....کو سننا " یا صرف " سننا یا سن لینا " ہوتے ہیں ۔ یہ فعل ہمیشہ متعدّی ہوتا ہے اگرچہ اکثر اس کا مفعول محذوف (اور غیر مذکور) ہوتا ہے ۔

● " سَمْعٌ " دراصل تو مصدر ہے بمعنی " سننا " ۔ پھر یہ " سماعت " (جو خود بھی مصدر ہے اور اردو میں مستعمل ہے) یا قوتِ سامعہ (سننے کی حس) اور بعض دفعہ خود " کان " (عضو سماعت) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ۔ تاہم چونکہ یہ لفظ (سمع) مصدر ہے اور مصدر میں قلت یا کثرت (بلحاظ عدد) دونوں کا احتمال ہوتا ہے اس لیے یہ واحد اور جمع دونوں معنوں کے لیے استعمال ہو سکتا ہے ۔ جیسے یہاں (آیت زیر مطالعہ میں) آیا ہے ۔ ویسے اس کی جمع مکسر " اسماع " وغیرہ آتی ہے ۔ تاہم قرآن کریم میں یہ لفظ بائیس (۲۲) جگہ آیا ہے اور ہر جگہ بصیغۂ واحد مگر (عموماً) بمعنیٔ جمع ہی استعمال ہوا ہے ۔ اور زیادہ تر (۱۲ جگہ) معرف باللام (السَّمْع) اور آٹھ جگہ مضاف ہو کر آیا ہے ۔ جس کی بنا پر یہ مصدری معنی (سننا) کی بجائے قوت سامعہ یا عضو سماعت (کان) کے معنی دیتا ہے ۔ اور شاید اسی بناء پر بیشتر مترجمین نے " علی سمعھم " کا ترجمہ " ان کے کانوں پر " کیا ہے بعض نے صرف واحد کے ساتھ " ان کے کان پر " کیا ہے یعنی لفظ کی رعایت سے ۔ اور جن مترجمین نے اس (سمعھم) کا ترجمہ " ان کی شنوائی " کیا ہے وہ مصدر کا ترجمہ حاصل مصدر کے ساتھ ہونے کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے ۔

اس مادہ (سمع) سے بکثرت اسماء اور مختلف ابواب سے بہت سے افعال قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں ۔ ہر ایک کا بیان اپنی اپنی جگہ ہوگا ۔ انشاء اللہ ۔

۲ : ۶ : ۱ (۴) [وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ] جو دراصل وَ + علی + ابصار + ھم کا مرکّب ہے ۔ اس میں وَ (اور) ، علی (پر) اور ھم (ان کی) کے معنی تو

اب آپ کو معلوم ہی ہو چکے ہیں (ابھی اوپر بھی اس کا ذکر ہوا ہے) البتہ توجہ طلب لفظ "البصار" ہے (اس لفظ کی عام عربی املاء یہی (البصار) ہے۔ اس کے رسم قرآنی یا عثمانی پر بات ابھی آگے بحث "الرسم" میں آئے گی)

● [البصار] کا مادہ "ب ص ر" اور وزن "اَفعال" ہے۔ یہ جمع مکسر ہے اور اس کا واحد "بَصَرٌ" بروزن "فَعَلٌ" ہے۔ اس مادہ (بصر) سے فعل ثلاثی مجرد "بصُر یَبصُر بَصَرًا (باب کرم سے) اور بَصِر یبصَر بصَرًا (باب سمع سے) آتا ہے اور اس کے بنیادی معنی "دیکھنا" ہیں ـــ یہ فعل "باء (بِ)" کے صلہ کے ساتھ بھی آتا ہے اور بغیر صلہ کے بھی ـــ اور دونوں صورتوں میں متعدی ہوتا ہے یعنی "بصُر بہ" و "بصِر بہ" اور "بصُرہٗ" اور "بَصِرہٗ" کے معنی "..... کو دیکھ لینا"، ..... کو جان لینا"، ..... کو سمجھ جانا" ہوتے ہیں[1] اس فعل میں محض آنکھ سے "دیکھ لینا" سے بڑھ کر دماغ سے "جان لینا" کا مفہوم بھی شامل ہوتا ہے۔ نیز صلہ ("بِ") کے ساتھ استعمال زیادہ فصیح شمار ہوتا ہے۔ اور قرآن کریم میں یہ فعل ہر جگہ باء (بِ) کے صلہ کے ساتھ اور وہ بھی صرف "باب کرُم" سے ہی آیا ہے۔ عربی میں یہ فعل "باب نصر" سے بھی مختلف معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے تاہم قرآن کریم میں یہ باب (نصر) اور اس کے معنی کہیں استعمال نہیں ہوئے۔

● "بصَرٌ" (جو "البصار" کا واحد ہے) دراصل تو اسی فعل ثلاثی مجرد (باب کرم یا سمع سے) کا مصدر بمعنیٔ "دیکھنا" ہے۔ پھر یہ بصارت بمعنی "نظر"، "نگاہ"، "بینائی" یا قوتِ باصرہ (دیکھنے کی حس) اور بعض دفعہ خود آنکھ (عضوِ بصارت) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے [خیال رہے لفظ "بصارت" جو عربی میں "بصارۃ" لکھا جاتا ہے۔ یہ خود بھی مذکورہ بالا دونوں ابواب سے ثلاثی مجرّد کا مصدر ہے]۔ اور پھر ان ہی (حِسّ یا آنکھ) کے معنی کے لحاظ سے اس کی جمع "ابصار" آتی

---

[1] دیکھئے مدالقاموس تحت مادہ "بصر"

ہے اور اسی لیے بیشتر مترجمین نے " علی ابصارھم " کا ترجمہ .... ان کی آنکھوں پر کیا ہے ۔ ورنہ مصدر میں تو قلت اور کثرت دونوں کا احتمال ہوتا ہے اور اسی لیے واحد (بصرٌ) بمعنیٔ جمع (ابصار) بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ تاہم لفظ "سَمْعٌ" کے برعکس (جو قرآن کریم میں ہر جگہ بصورت واحد (سمعٌ) ہی استعمال ہوا ہے) یہ لفظ (بصَرٌ) زیادہ تر بصورت جمع (ابصار) ہی استعمال ہوا ہے ــــ معرف باللام ہو کر (الابصار) بھی اور مضاف ہو کر بھی (جیسے یہاں آیت زیر مطالعہ میں ہے)۔

● قرآن کریم میں لفظ " سمع " (جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے) مختلف شکلوں (مفرد مرکب معرفہ نکرہ) میں بائیس (۲۲) جگہ آیا ہے اور ہر جگہ اسی طرح (بصیغۂ واحد) ہی آیا ہے البتہ لفظ " اذن " (کان) واحد تثنیہ جمع ہر طرح استعمال ہوا ہے ۔ اس پر بات اپنی جگہ ہو گی ۔ اس کے مقابلے پر لفظ " بصر " (بصیغۂ واحد) زیادہ تر (۸ جگہ) معرف باللام (البصر) اور دو جگہ مضاف ہو کر آیا ہے ۔ اور بصیغہ جمع (ابصار) یہ لفظ معرفہ نکرہ مفرد مرکب شکلوں میں چالیس[؟] کے قریب مقامات پر وارد ہوا ہے۔ واحد جمع کے اس فرق کے علاوہ جہاں بھی یہ دونوں لفظ (سمع اور ابصار) ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں " سمع " پہلے اور " ابصار " بعد میں آیا ہے ۔ بعض اہل علم نے اس فرق کی توجیہ کی کوشش بھی کی ہے [1] یہ اہل تفسیر کا میدان ہے ہم تو اہل عرب کے استعمال اور ان کے ذوقِ فصاحت کو ہی اس کی وجہ سمجھتے ہیں ــــــــ اس مادہ (بصر) سے بکثرت اسماء و افعال (۱۵۰ کے قریب مقامات پر) آتے ہیں ۔ جن پر اپنے اپنے موقع پر بات ہو گی ۔ ان شاء اللہ۔

۲ : ۶ : ۱ (۵) [غِشَاوَةٌ] کا مادہ "غ ش و" اور وزن "فِعَالَةٌ" ہے ۔ اس لفظ کی بھی عام عربی املاء ــــ رسم معتاد کے مطابق ــــ یہی (غشاوة)

---

[1] روح المعانی ج ۱ ص ۱۳۶ پر بھی اس توجیہ کا مختصراً ذکر ہے۔ تاہم جو حضرات تفصیل چاہتے ہوں ان کے لیے علی ناصف النجدی کی کتاب " مع القرآن الکریم " (طبع دار المعارف) میں شامل بحث بعنوان " السمع و المبصر فی القرآن الکریم " (ص ۶۱ تا ۷۰) کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا۔

ہے۔اس کے رسمِ قرآنی یا رسمِ عثمانی پر بات ابھی آگے "الرسم" میں ہوگی۔ اس مادہ (غ ش د) سے فعل ثلاثی مجرد زیادہ تر باب سمِع سے، متعدّی اور بغیر صلہ کے آتا ہے "غشِی ..... یَغشٰی (دراصل غشِو یغشَوُ) غَشَاوۃً" — اور اس کے معنی ہیں: "..... کو ڈھانپ لینا، چھپا لینا یا ..... پر چھا جانا" — یہ فعل یائی اللام مادہ (غ ش ی) سے بھی اسی باب (سمع) سے اور ان ہی (مذکورہ بالا) معنی کے لیے آتا ہے۔ البتہ "یائی" کی صورت میں مصدر "غشایۃ" ہو جاتا ہے۔ مزید فیہ کے باب استفعال سے بھی دونوں مادے ہم شکل (اِستَغشٰی) اور ہم معنی (کپڑا اوڑھ لینا یا لپیٹ لینا) استعمال ہوتے ہیں البتہ، بعض اصحاب لغت (مثلاً اقرب الموارد) کے نزدیک، مزید فیہ کے ابواب اِفعال، تفعیل اور تفعل (اَغشٰی، غشّٰی، تغشّٰی) صرف یائی اللام مادے سے آتے ہیں — ویسے صرفی تعلیل کے لحاظ سے بھی واوی ہو یا یائی دونوں کی شکل یکساں ہی رہتی ہے۔ اس مادہ (یا ان دونوں مادوں) سے اسماء اور افعال کی متعدد صورتیں قرآن کریم میں وارد ہوئی ہیں — ہر ایک کا بیان اپنے اپنے موقع پر آئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

● لفظ "غِشَاوَۃ" دراصل تو فعل ثلاثی مجرد کا ایک مصدر ہے۔ پھر مصدر بمعنیٰ اسم الفاعل لیتے ہوئے "غشاوۃ" سے مراد وہ چیز لی جاتی ہے جس سے کسی شے کو ڈھانپنے کا کام لیا جائے یا جو ڈھانپ دینے کا کام دے۔ اور یہ لفظ (غشاوۃ) حسی سے زیادہ معنوی مفہوم کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور خصوصاً آنکھ یا دل کو ڈھانپ لینے۔ یا ان پر "پردہ ڈالنے" کے معنی دیتا ہے۔ ان معنی کے لیے عربی زبان میں یہ لفظ (غشاوۃ) مثلث الغین ہے یعنی اس کی "غ" پر تینوں حرکات (ـَ، ـِ، ـُ) پڑھی جا سکتی ہیں۔ تاہم قرآن کریم میں (خصوصاً روایتِ حفص میں) یہ لفظ "غ" کی کسرہ (ـِ) سے ہی پڑھا گیا ہے۔ اور مندرجہ بالا مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے اکثر مترجمین نے اس لفظ کا اردو ترجمہ "پردہ" ہی کیا ہے۔ ایک صاحب نے غالباً محاورے کے جوش میں اس کا ترجمہ "گھٹاٹوپ" بھی کر دیا ہے جو بظاہر "غشاوۃ"

سے زیادہ " مُظلِم یا ظلُمات " کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

[وَلَهُمْ] میں " وَ " عاطفہ (بمعنی اور) ہے اور " لَهُمْ " میں ضمیر مجرور (هُمْ) سے پہلے لام الجرّ (لِ) ہے جو ضمائر کے ساتھ (یائے متکلّم کے سوا) ہر جگہ مفتوح (لَ) پڑھی جاتی ہے۔ یوں " وَلَهُمْ " کا لفظی ترجمہ بنتا ہے " اور ان کے لیے " (ہوگا یا ہے)

۲:۶:۱(۶) [عَذَابٌ] لفظ " عذاب " کا مادہ " ع ذ ب " اور وزن " فَعَالٌ " ہے۔ اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد مختلف ابواب سے مختلف معنوں کے لیے کبھی لازم اور کبھی متعدّی آتا ہے مثلاً " عذَب یعذِب عَذْبًا " (باب ضرب سے) کے معنی ہوتے ہیں: " کسی کو روک دینا (مثلاً کہیں گے " عذب فلانا ") اور اسی کے معنی " پیاس کی شدّت کے باعث کھانا یا نیند چھوڑ دینا " بھی ہوتے ہیں (مثلاً کہیں گے " عذَبَ الرجلُ ") اور ایسے آدمی کو " عاذِب " کہتے ہیں۔ عذِب یعذَب عَذَبًا (باب سمع سے) کے معنی " پانی کی سطح پر سبز کائی سی آجانا " ہیں۔ مثلاً عذِبَ الماءُ (پانی کا کائی والا ہونا)۔ اور عذُب یعذُب عَذُوبۃً (باب کرم سے) کے معنی " پانی کا میٹھا (عَذْبٌ) ہونا " ہوتے ہیں۔ — تاہم قرآن کریم میں اس مادہ (عذب) سے فعل ثلاثی مجرد کہیں بھی اور کسی معنی میں بھی استعمال نہیں ہوا۔

● لفظ " عذاب " جو اس مادہ (عذب) سے ایک جامد اسم ہے اس کے لغوی معنی یوں بیان ہوتے ہیں: " ہر وہ چیز جو انسان پر گراں گذرے اور اسے اس کے ارادوں سے روک دے "[1] اردو میں " عذاب " کا ترجمہ " سزا " یا " مار " کیا جاتا ہے۔ خود لفظ " عذاب " بھی اردو میں مستعمل ہے۔ لفظ عذاب عموماً جسمانی سزا یا مار کے لیے آتا ہے۔ مگر بطور استعارہ کسی سخت تکلیف دہ ذہنی

---

[1] اقرب الموارد۔ راغب نے مفردات میں " عذاب " کے معنی " ایجاع شدید " یعنی سخت درد (دکھ) پہنچانا " بتائے ہیں جو بنیادی طور پر " جسمانی مار " کے لیے ہی ہے۔

اور نفسیاتی کیفیت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ عربی کا لفظ "عقوبت" بھی عذاب کے ہم معنی اور اردو میں متعارف ہے۔

● "راغب" نے "مفردات" میں عذاب کے ان معنوں کی اصل یا مناسبت کے بارے میں تین چار اقوال بیان کئے ہیں[1]۔ ان میں سے بظاہر یہی (روک دینا یا رک جانا والے) معنی زیادہ مناسب اصل معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ عذاب کا مقصد سزا پانے والے کو یا دوسروں کو اس کام سے روکنا اور باز رکھنا بھی ہوتا ہے۔ اور چونکہ "سزا دینا" کے لیے عربی میں اس مادہ سے فعل باب "تفعیل" سے (عذّب یعذِّب تعذیباً) آتا ہے۔ اس لئے "راغب" نے کچھ معنوی مناسبتیں اس باب (تفعیل) کی بعض "خاصیات" پر بھی قائم کی ہیں مثلاً اس باب (تفعیل) کی ایک خاصیت "ازالہ (ہٹا دینا)" ہے اس لیے تعذیب (عذاب دینا) کا مطلب "زندگی کی 'شیرینی' (عذب) کو ہٹا دینا" ہے ــــ یا مثلاً اس باب کی ایک خاصیت "کوئی کام شدت اور کثرت سے کرنا" بھی ہے۔ اس سے ہی "عذّبہ" کے ایک معنی "عَذَبۃ السوط" (کوڑے کے کناروں) سے بہت زیادہ مارنے کے بھی ہوتے ہیں۔ اردو مترجمین میں سے جنہوں نے "عذاب" کا ترجمہ "مار" کیا ہے، غالباً ان کے سامنے یہی مؤخر الذکر مناسبت تھی۔

● قرآن کریم میں اس مادہ (عذب) سے صرف باب تفعیل کے کچھ صیغہ ہائے فعل اور متعدد مشتق اور جامد اسماء وارد ہوئے ہیں۔ ان کا بیان اپنے موقع پر ہوگا۔ انشاء اللہ۔ خیال رہے کہ صرف یہی لفظ (عذاب) مختلف صورتوں (مثلاً معرفہ، نکرہ، مفرد، مرکب شکل) میں تین سو سے زیادہ جگہ (قرآن کریم میں) وارد ہوا ہے۔ اور بیشتر موصوف ہو کر آیا ہے اور اس کی صفت کے طور پر زیادہ تر عظیم، الیم، مُھین، مُقیم اور شدید وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کی وضاحت بھی انشاء اللہ اپنے اپنے مقام پر ہوگی۔

<u>۲:۶:۱(۷)</u> [**عَظِيْمٌ**] کا مادہ "ع ظ م" اور وزن "فَعِيْلٌ" ہے۔

---

[1] دیکھئے: راغب (المفردات) نیز LANE کی مدالقاموس تحت مادہ "عذب"

اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد باب " نصر " سے متعدی اور باب " کرُم " سے لازم آتا ہے مثلاً عظَم یعظُم عظماً (نصر) کے معنی " کسی کی ہڈیوں پر مارنا " یا " کتّے کو ہڈی ڈالنا " ہوتے ہیں ـــــ اور عظُم یعظُم عِظَماً (کرم) کے معنی " بڑا یا عظمت والا ہونا " ہیں ـــ تاہم قرآن کریم میں اس مادہ سے فعل ثلاثی مجرد کہیں بھی، کسی باب سے اور کسی بھی معنی کے لیے نہیں آیا ۔

البتّہ یہ لفظ (عظیم) باب کرم سے صفت مشبّہ بروزن " فعیل " ہے ۔ اور اس کا اردو ترجمہ " بڑا " یا " بہت بڑا " کیا جاتا ہے اور خود لفظ " عظیم " بھی اردو میں رائج ہے ۔ قرآن کریم میں یہ لفظ (عظیم) مختلف صورتوں میں سو سے زیادہ جگہ آیا ہے ۔ اور اس مادہ (عظم) سے باب تفعیل اور افعال کے (صرف تین صیغہ ہائے فعل کے علاوہ متعدد اور مختلف المعنی مشتق اور جامد اسماء بھی وارد ہوئے ہیں ۔ ـــ ان سب کا بیان بھی اپنی اپنی جگہ آئے گا ۔ انشاء اللہ تعالےٰ ۔

ملاحظہ ! یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آیتِ زیر مطالعہ میں ضمیر مجرور جمع مذکر غائب (ھُم) تین جگہ (قلوبِھِمْ ، سَمْعِھِمْ اور ابصارِھِمْ) ماقبل مکسور ہونے کے باعث " ھِمْ " (بکسر الھاء) پڑھی جاتی ہے ۔ (البتّہ " وَلَھُم " میں وہ اپنی اصلی شکل میں ہے ۔ کیونکہ یہاں اس کا ماقبل مفتوح ہے ۔

۲:۶:۲ الإعراب

(ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم ۔ وعلی ابصارھم غشاوۃ ۔ ولھم عذاب عظیم)

یہ آیت تین جملوں پر مشتمل ہے جو واو العطف کے ذریعے ملائے گئے ہیں ۔ ہر ایک جملے کی ترکیب یوں ہے :-

(۱) [خَتَمَ] فعل ماضی معروف صیغہ واحد مذکر غائب اور [اللّٰہُ] اس کا فاعل (لھذا مرفوع) ہے ۔ علامتِ رفع " اللہ " کی " ھا " کا ضمہ (ـُ) ہے ۔ [علی] حرف الجر ہے جو یہاں فعل (ختَم) کے صلہ کا کام بھی دیتا ہے ۔

[قلوبِهِم] میں " قلوب " مجرور بالجر (علی) ہے اور "ھم" ضمیر مجرور ہے۔ اور پورے مرکّب جارّی (علی قلوبھم) کو چاہیں تو متعلق فعل (ختَم) سمجھ لیں اور چاہیں تو " علی " کو " خَتَم " کا صلہ سمجھ کر " علی قلوبھم " کو مفعول بہٖ اور (لھٰذا) محلاً منصوب قرار دے لیں۔ دونوں صورتوں میں لفظی اردو ترجمہ " (اللہ نے) مہر کر دی ان کے دلوں پر " ہوگا۔ اس کے بعد [وَ] واوِ عاطفہ بمعنی " اور " ہے اور اس کے ذریعے اگلی عبارت (علی سمْعِھم) کا عطف فعل " ختَم " پر ہے یعنی " وَختمَ علی سمعھم " مراد ہے۔ اور یہ [علی سَمْعِھِم] جس میں " علی " حرف الجرّ اور " سمِع " مضاف بھی ہے اور مجرور بالجر بھی — اور آخری " ھم " ضمیر مجرور مضاف الیہ ہے — اور یوں یہ سارا مرکّب جارّی (علی سمْعِھم) بھی " علی قلوبھم " کی طرح جار مجرور متعلق فعل (ختَم) ہے یا مفعول ہونے کی بنا پر محلاً منصوب ہے — " سمْعِھم " میں " سمْع " کے مصدر ہونے اور اس لیے واحد یا جمع کے لیے یکساں استعمال پر بات ہو چکی ہے (۲:۶:۱(۳)) ۔ البتہ بعض نحوی حضرات یہاں " سمع " کو واحد ہی مان کر اس سے پہلے لفظ " مواضع " (جگہیں) مقدر مان لیتے ہیں گویا تقدیرِ عبارت (دراصل) یوں ہے :" وَعلیٰ مواضعِ سمعھم " (یعنی ان کی سننے کی جگہوں پر) ۔ اور مراد اس سے بھی بہرحال وہی " کانوں پر " ہی ہوگا۔

● بعض مترجمین نے لفظ " سمع " (واحد) کا لحاظ کرتے ہوئے " علی سمعھم " کا ترجمہ " ان کے کان پر " کیا ہے۔ تاہم اکثر نے معنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جمع کے ساتھ " ان کے کانوں پر " ترجمہ کیا ہے — بعض حضرات نے اس پوری عبارت (.... علی قلوبھم و علی سمعھم) میں " علی " کی تکرار کا ترجمہ تو کیا ہے مگر ضمیر مجرور (ھُم) کا ترجمہ صرف ایک دفعہ کیا ہے یعنی " ان کے دلوں پر اور کانوں پر " — اور بعض نے اس کے برعکس " ضمیر دل " کا ترجمہ تکرار مگر " علی " کا ترجمہ صرف ایک بار کیا ہے۔ یعنی " ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر "

—— جب کہ بعضؒ نے " علی " اور " ھم " دونوں کی تکرار کو چھوڑ کر ترجمہ کیا ہے یعنی " ان کے دلوں اور کانوں پر "۔ ترجمہ کی مندرجہ بالا (آخری تینوں) صورتیں محاورے اور مفہوم کے لحاظ سے درست ہیں مگر ان میں قرآن کریم کی اصل عبارت سے قدرے انحراف ضرور موجود ہے ۔ یہاں تک (ختم اللہ ...... سے علی سمعھم تک) پہلا جملہ فعلیہ ختم ہوتا ہے اس کے بعد اگلا جملہ (اسمیہ) شروع ہوتا ہے ۔

(۲) [وَ] یہاں واو عاطفہ نہیں بلکہ واو الاستیناف ہے جس سے ایک الگ جملے کی ابتداء ہوتی ہے ۔ اگر یہاں بھی " واو " کو عاطفہ مانیں تو [علی ابصارھم] جس میں " علی " حرف الجر، " ابصار " مجرور بالجر نیز مضاف ہے اور " ھم "، ضمیر مجرور مضاف الیہ ہے) —— کی حد تک تو بات بن جاتی ہے ۔ یعنی اس کا عطف بھی " ختَمَ اللہ " پر سمجھا جا سکتا ہے ۔ اس صورت میں ترجمہ ہو گا ـ " اور ان کی آنکھوں پر (بھی مہر لگادی) " مگر اس صورت میں اگلا لفظ [غشاوۃٌ] جملہ کی ترکیب میں کسی طرح فِٹ نہیں بیٹھتا ۔ اس لیے ضروری ہوا کہ اس " وَ " کو واو الاستیناف اور اس کے بعد آنے والے جملے کو مستانفہ (الگ جملہ) مانا جائے ۔ اس صورت میں یہ پورا مرکب جارّی (علی ابصارھم) خبر مقدم یا قائم مقام خبر مقدم ہو گا اور " غشاوۃٌ " مبتدا مؤخر نکرہ ہو کر مرفوع ہے (" فی البَیْتِ رَجُلٌ " کی طرح) اور علامتِ رفع آخری " ۃٌ " کے دو ضمہ (ــٌـ) ہیں اور اسی لیے اسے تنوینِ رفع کہتے ہیں —— اس ترکیب کے مطابق " علی سمعھم " کے بعد وقف ہو گا ۔ (جسے اکثر مصاحف میں وقفِ مطلق (ط) سے ظاہر کیا گیا ہے ۔ اسی چیز کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو مترجمین نے اس حصۂ آیت (وعلی ابصارھم غشاوۃ) کو الگ جملہ سمجھتے ہوئے اس کا ترجمہ " اور ان کی آنکھوں پر پردہ (پڑا ہوا) ہے " کیا ہے ۔ بلکہ لفظ " غشاوۃ " کی تنکیر (نکرہ ہونا) کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کا اردو ترجمہ " ایک پردہ " یا " ایک

بڑا پردہ" سے کیا جائے۔ اس کے بعد تیسرا جملہ شروع ہوتا ہے۔
(۳) [وَلهم] کی "واو" کو استیناف کی واو بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد ایک الگ جملہ (لهم عذاب عظيم) ہے۔ اور چاہیں تو اُسے واو العطف بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے اس جملے (لهم عذاب عظيم) کا عطف اس سے پہلے جملے (وعلى ابصارهم غشاوة) پر ہے یعنی دونوں جملے " اور " کے ذریعے ملائے گئے ہیں۔ اور اسی نحوی توجیہ کی بنا پر یہاں (یعنی اس دوسری " واو " سے پہلے) بھی وقف کی علامت لکھی جاتی ہے۔ جو بعض مصاحف میں " ز " اور بعض میں " صلے " لکھی ہوتی ہے یعنی " الوقف جائز مع كون الوصل اولى " (یہاں وقف ہو سکتا ہے مگر وصل کا پہلو زیادہ قوی ہے) —— استیناف سمجھیں تو وقف کا جواز نکلتا ہے مگر جملے کے جملے پر معطوف ہونے کی بناء پر وصل کی وجہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔

بہرحال [لهم] یہاں بھی جار مجرور مل کر خبر۔ یا قائم مقام خبر۔ مقدم کا کام دے رہا ہے۔ اور [عَذَابٌ] مبتدأ مؤخر نکرہ ہو کر مرفوع ہے (علامتِ رفع " ب " کے دو ضمہ (ـٌ) یعنی تنوین رفع ہے) اور [عَظِيمٌ] اس (عذاب) کی صفت ہونے کی بناء پر ہر لحاظ (حالت۔ جنس۔ عدد اور وسعت ہر لحاظ) سے اپنے موصوف (عذاب) کے مطابق ہے۔

۳:۶:۲ الرسم

(ختم الله على قلوبهم وعلى سمعهم۔ وعلى ابصارهم غشاوة۔
ولهم عذاب عظيم)

[ختم الله] میں لفظِ جلالت (الله) کی اس مخصوص املاء (جو رسم عثمانی اور رسم معتاد۔ دونوں۔ میں یکساں ہے) پر سورۃ الفاتحہ کے شروع میں "بسم الله" کے ضمن میں بات گذر چکی ہے (۱:۱:۲ (۲)) [على] کا رسم املائی اور رسم عثمانی بھی

ـــ دونوں طرح ـــ " لام " کے بعد " یاء " کے ساتھ ہے۔ یعنی یہ پڑھا " عَلا " مگر لکھا " علی " جاتا ہے۔ [قلوبھم] اور [سمعھم] میں ضمیر مجرور متصل (ھم) موصول (ملا کر) لکھی جاتی ہے اور یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ (آگے چل کر) بعض جگہ یہ ضمیر " ھم " اپنے ماقبل سے مقطوع (الگ) لکھے جانے کی مثالیں بھی سامنے آئیں گی۔ [وعلی ابصارھم غشاوۃ] میں کلمات " ابصار " اور " غشاوۃ " کا رسم بھی مختلف فیہ ہے۔ تفصیل اس کی یوں ہے :

● بیشتر عرب اور افریقی ملکوں کے مصاحف میں یہ " اَبْصٰر " (بحذف الالف بعد الصاد) اور " غشٰوۃ " (بحذف الالف بعد الشین) لکھے جاتے ہیں۔ سعودی، مصری اور شامی مصاحف میں یہ آپ کو اسی طرح لکھے ملیں گے۔

(۱) لفظ " ابصار یا ابصٰر " قرآن کریم میں مفرد یا مرکب شکل میں انتالیس (۳۹) دفعہ آیا ہے۔ اور بعض علمائے رسم کے نزدیک اس کا عثمانی " رسم " ہر جگہ " ابصٰر " (بحذفِ الف) ہی ہے۔ تاہم دنیائے اسلام کے مشرقی ممالک میں ـــ اور عرب افریقی ممالک میں سے صرف لیبیا میں ـــ اسے ہر جگہ باثباتِ الف (ابصار) لکھنے کا رواج چلا آتا ہے۔ ایران، ترکی، افغانستان، برصغیر اور چین وغیرہ کے مصاحف میں یہی املاء (ابصار) رائج ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ صاحب " نثر المرجان " نے اس لفظ (ابصار) میں اثبات الالف کو اکثریت کا عمل قرار دیا ہے اور " حذف الالف " کو " قِیْل " (کہا گیا ہے) کہہ کر بیان کیا ہے (البتہ انہوں نے اپنے ایک اہم مصدر اور مرجع " قلمی مصحف الجزری " میں اس لفظ کے " محذوف الالف " لکھے ہونے کا ذکر کیا ہے[1]۔ بیشتر عرب اور افریقی ممالک کے مطابق یہ (اثبات الالف) رسم عثمانی کی خلاف ورزی ہے۔ " سمیر الطالبین " میں " حذف الالف بعد الصاد " کے تحت " والبصٰر کیف جاء " (یعنی لفظ " البصٰر " کا ہر

---

[1] نثر المرجان ج ۱ ص ۱۰۶

جگہ محذوف الالف لکھا جانا بیان کیا گیا ہے[1] مگر یہ متفق علیہ قول نہیں ہے۔ راقم الحروف کو پڑتال کرنے پر معلوم ہوا کہ الدانی (" المقنع " میں) اور الشاطبی (" العقیلہ " میں) محذوف الالف کلمات کی بات کرتے ہوئے اس لفظ (البصار) میں حذف کے بارے میں بالکل خاموش ہیں اور یہ خاموشی عدم حذف کو مستلزم ہے۔ البتہ " مورد الظمآن " (للخراز) میں " البصار " کے محذف الالف ہونے کا قول صرف ابوداؤد (سلیمان بن نجاح) کی طرف منسوب کیا گیا ہے[2]

(۲) لفظ " غشاوۃ " کا بھی یہی قصہ ہے یعنی بیشتر عرب اور افریقی ملکوں کے مصاحف میں یہ کلمہ " غِشٰوَۃ " (بحذف الالف بعد الشین) لکھا جاتا ہے اور وہ اسے رسم عثمانی کا اتباع سمجھتے ہیں۔ تاہم عرب اور افریقی ممالک میں سے صرف لیبیا اور تمام ایشیائی (غیر عرب) مسلم ممالک ـــــ کے مصاحف میں یہ لفظ ہمیشہ "غشاوۃ" (باثبات الالف بعد الشین) ہی لکھا جاتا ہے ـــــ یہ لفظ (غشاوۃ) قرآن کریم میں صرف دو جگہ آیا ہے ایک یہاں (البقرہ : ۷) اور دوسرا " الجاثیۃ : ۲۳ " میں ـــــ سورۃ الجاثیۃ والے لفظ کے محذوف الالف ہونے پر تو مؤلف "سمیر الطالبین" نے دونوں ائمہ رسم ـــــ یعنی الدانی اور ابوداؤد ـــــ کا اتفاق بیان کیا ہے[3] اس پر مزید بحث تو اپنی جگہ (الجاثیہ : ۲۳) پر کی جائے گی ـــــ مگر سورۃ البقرہ : ۷ یعنی زیر مطالعہ آیت میں وارد لفظ (غشاوۃ) کے محذوف الالف ہونے پر " الدانی " یا " الشاطبی " سے کوئی تصریح ثابت نہیں ہے۔ البتہ صرف ابوداؤد سے حذف الالف والا قول منقول ہے[4] بلکہ صاحب نثر المرجان نے تو یہاں (البقرہ : ۷) کے بارے میں بھی " اثبات الالف بعد الشین " (یعنی " غشاوۃ " لکھنے) کو " عند الاکثر " کہا ہے۔ اور " خلاصۃ الرسوم " کے حوالے سے "حذفها البعض"

---

[1] سمیر الطالبین للضباع ص ۵۲

[2] دلیل الحیران (شرح مورد الظمآن للمارغنی ص ۶۵

[3] سمیر الطالبین ص ۵۰

[4] دلیل الحیران ص ۸۷

لکھا ہے۔ اور پھر یہ بھی تصریح کی ہے کہ یہاں "الف" کے حذف یا اثبات کے بارے میں الدانی، الشاطبی، السیوطی اور مؤلف "خزانۃ الرسوم" میں سے کسی نے بھی واضح طور پر کچھ نہیں کہا ہے[1] اور جب تصریح نہ ہو تو پھر لفظ کو عام معتاد عربی املاء کے مطابق لکھنا درست اور جائز ہے۔

● خلاصۂ بحث یہ ہے کہ ان دونوں کلمات (ابصار اور غشاوۃ) کی مصحف میں کتابت کے بارے میں عرب اور عام افریقی ممالک میں عمل "حذف الالف" پر ہے اور ان کی دلیل ابوداؤد کی تصریح یا ترجیح ہے (جو "مورد الظمآن" میں بیان ہوئی ہے۔ ابوداؤد کی اصل کتاب ابھی تک کہیں طبع نہیں ہوئی) اور تمام مشرقی ممالک اور لیبیا میں اثباتِ الف ہی معمول بہ ہے۔ تاہم دونوں کے نزدیک اس (اثبات) کی وجہ الگ الگ ہے۔ اہلِ مشرق میں یہاں اثباتِ الف کی کوئی واضح دلیل کسی کتاب میں نظر سے نہیں گزری۔ غالباً تساہل کی بناء پر عام معتاد رسم کا رواج ہو گیا اور پھر "عمل الاکثر" بن گیا۔ اور ہو سکتا ہے کہ حذف کے بارے میں "الدانی" اور "الشاطبی" کی خاموشی ہی اس کا باعث بنی ہو ——— البتہ اہل لیبیا کی دلیل واضح ہے کہ وہ بصورتِ اختلاف (اور ایک کی خاموشی اور دوسرے کی تصریح بھی اختلاف ہی کی ایک صورت ہے)۔ الدانی کو ابوداؤد پر ترجیح دیتے ہیں[2] اور الدانی کی کتاب "المقنع" میں اس (حذف) کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ملتی۔ بلکہ الشاطبی (صاحب العقیلہ) جس کی بنیاد "المقنع" ہی ہے ——— وہ بھی اس بارے میں خاموش ہے اور یہی چیز یہاں اثباتِ الف کو مستلزم ہے۔ رہ گئی اس حذف کے بارے میں ابوداؤد کی (طرف منسوب) تصریح تو وہ (اہلِ لیبیا) اسے حجت نہیں مانتے۔

● اس ساری بحث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ لفظ "صراط"[3] کی طرح

---

[1] نثر المرجان ج ۱ ص ۱۰۶

[2] دیکھئے مصحف الجماھیریہ کا ضمیمہ "التعریف بھذا المصحف"

[3] دیکھئے "الصراط" کے رسم پر بحث سورۃ الفاتحہ: ۶ (۵:۱:۲:۱(۱) میں)

ان دو کلمات (البصار اور غشاوۃ) کی باثبات الالف کتابت رسمِ عثمانی کی صریح خلاف ورزی نہیں ہے جیسا کہ عرب اور افریقی ملکوں میں خیال کیا جاتا ہے — اور "غشاوۃ" (یا غشوۃ) کے رسم کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہاں آخری "تا" ہمیشہ مربوطہ (ۃ) لکھی جاتی ہے اور اس لیے بصورت وقف اسے "ھا" (ہ) پڑھا جاتا ہے۔

[وَلَهُمْ] میں حرف الجر (لام) اور ضمیر مجرور متصل ملا کر (موصول) لکھے جاتے ہیں۔ اور یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ آگے چل کر قرآنِ کریم میں ایسے کلمات بھی آئیں گے جہاں یہ حرف جر (لِ) ملا کر (موصول) لکھنے کی بجائے الگ (مقطوع) لکھا جاتا ہے۔ اس پر بات اپنے موقع پر ہوگی [عذابٌ] یہ لفظ بالاتفاق باثبات الالف بعد الذال لکھا جاتا ہے۔ رسمِ عثمانی کے علماء نے اس لفظ (عذاب) کے قرآن کریم میں ہر جگہ باثبات الالف لکھے جانے کی تصریح کی ہے[1] یہ لفظ (عذاب) قرآن کریم میں معرفہ نکرہ، مفرد، مرکب مختلف شکلوں میں ۳۲۲ جگہ آیا ہے اور ہر جگہ اسی طرح باثبات الالف ہی لکھا جاتا ہے یعنی اس لفظ کا رسمِ املائی اور رسمِ عثمانی یکساں ہے۔ اسی طرح اگلا لفظ [عظیم] بھی ہر جگہ باثبات الیاء بعد الظاء لکھا جاتا ہے۔ یہ وضاحت بھی بظاہر غیر ضروری معلوم ہوتی ہے مگر قرآن کریم میں بعض اس سے ملتے جلتے کلمات میں یہ "یاء" (ماقبل مکسور) حذف کر دی جاتی ہے۔ اگرچہ پڑھی جاتی ہے۔ مثلاً بعض جگہ "ابراھیم" بحذف الیاء لکھا جاتا ہے۔ اس کا ذکر بھی اپنی جگہ آئیگا۔

۲:۶:۴ الضبط

اختلافِ ضبط کے سلسلے میں اب تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اکثر یہ بھی لکھتے آئے ہیں کہ فلاں طریقِ ضبط کن ملکوں میں رائج ہے۔ امید ہے کہ قارئین اب تک یہ جان چکے ہیں کہ فلاں طریقِ ضبط فلاں علاقے کے مصاحف کی کتابت میں استعمال ہوتا ہے۔ اصل ضبط کے قواعد کی مجموعی تعداد دس اور پندرہ کے درمیان

---

[1] دلیل الحیران ص ۴۴